خواجہ عبدالحمید یزدانی

مثنوی رومی میں ذکر خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

دفتر سوم کے شروع میں "قصہ خورندگان پیل بچگان از حرص . . ." میں دو تین مرتبہ حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ سعادت اثر آیا ہے۔ اس قصے میں مولانا رومی نے بچگان فیل کے شکاریوں کی، جو کسی داناکی نصیحت سے اغماض برتتے اور بعد میں نقصان اٹھاتے ہیں، تمثیل کے ذریعے اولیاء اللہ کی دل آزاری کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔ اس حصے میں ایک جگہ رقص کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے ایسے رقص کی تحریض کی ہے جس سے انسان حرص و شہوت سے پاک ہو کر اپنی ذات کو فنا کر دے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ مردانِ خدا اپنے خون میں رقص کرتے ہیں اور یہ کہ فطرت کے رقص کو سمجھنے کے لیے گوشِ دل کی ضرورت ہے۔ ان ظاہری کانوں کو بند کر کے ہی فروغ جاں حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ظاہر سے گریز کر کے صرف اسی ذاتِ اقدس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ یہاں لفظ "گوش" آجانے کے سبب مولانا سورہ التوبہ کی ایک آیت کے حوالے سے سرورِ کائنات کو سراپا گوشِ (باطن) کہتے ہیں۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم باتوں ہی باتوں میں اسرار کو بھانپ جاتے تھے۔ اس کے بعد پھر حضورؐ کی ذات پاک کو سراپا چشم و گوش کہہ کر حضور کی رحمت و نوازش کو دایہ اور عام انسان کو شیر خوار بچے سے تشبیہ دی ہے۔ اور پھر رجوع بقصہ مذکور ہے:

رقص و جولان بر سر میدان کنند — رقص اندر خون خود مردان کنند
چون رہند از دست خود دستی زنند — چون جہند از نقص خود رقصی کنند
مطربانشان از درون دف میزنند — بحرہا در شورشان کف می زنند
تو نہ بینی برگہا با شاخ ہا — کف زنان رقصان زتحریک صبا
تو نہ بینی لیک بہر گوششان — برگہا با شاخہا ہم کف زنان
تو نہ بینی برگہا را کف زدان — گوش دل باید نہ این گوش بدن
گوش سر بربند از ہزل و دروغ — تا بہ بینی شہر جان را با فروغ

هین دهان بربند از هزل ای عمو | جز حدیث روی دو چیزی مگو
سر کشد گوش محمد در سخن | کش بگوید در نبی حق هو اذن[۱]
سر بسر گوش است و چشم است آن نبی | رحمت او مرضعست و ما صبی[۲]

مذکورہ شکاری ہاتھی کا بچہ بھون بھان کر کھا جاتے ہیں اور وہیں سو جاتے ہیں، صرف ایک شکاری اس سے اجتناب برتتا ہے۔ اسی اثنا میں ہتھنی بچے کی تلاش میں چنگھاڑتی ہوئی ادھر آ پہنچتی اور خوابیدہ شکاریوں کے منہ سونگھنے لگتی ہے۔ جس شکاری نے دانا کی نصیحت پر عمل کیا اور کباب فیل کھانے سے احتراز کیا تھا وہ تو بچ جاتا ہے لیکن جس جس کے منہ سے کباب کی بو آتی ہے، ہتھنی اسے ہوا میں اچھال کر زمین پر پٹخ دیتی اور ہلاک کر ڈالتی ہے۔ یہاں مولانا نے بو کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ اہل دل بو کی بنا پر، جو گویا ایک قسم کی لہروں یا ارتعاشات کی صورت میں ہوتی ہے، صاحب بو کے سیرت و کردار کی خوبی و برائی کو جان اور پہچان جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح اللہ اپنے بندوں کے عیوب چھپاتا ہے اسی طرح اللہ کے خاص بندے بھی کہ "تخلقوا باخلاق اللہ"، کے آئینہ دار ہوتے ہیں، عوام الناس کے عیوب پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا رومی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کر کے حضور کی سیرت طیبہ کے اس پہلو کو پیش کیا ہے کہ حضور جاننے کے باوجود بھی کسی کی برائیوں کو اچھالتے نہیں تھے بلکہ پردہ پوشی اور اغماض سے کام لیتے تھے تاکہ وہ شخص شرمسار نہ ہو اور اس کی دل آزاری نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد مولانا نے بتایا ہے کہ انسان کی برائیوں کی بو ہر صورت میں، خواہ وہ بیدار ہو یا محو خواب، دوسروں تک پہنچتی ہے[۳] اور خیر و شر کی خبر دیتی ہے

---

[۱] سورہ التوبہ، آیہ ۶۱: ان (منافقین) میں سے بعضے ایسے ہیں کہ نبی کو ایذائیں پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ وہ نبی کان دے کر تو وہی بات سنتے ہیں جو تمہارے حق میں خیر (ہی خیر) ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور مومنین کا یقین کرتے ہیں اور آپ ان لوگوں کے حال پر مہربانی فرماتے ہیں جو تم میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔

[۲] کتاب مثنوی، ص ۲۰۴، ۲۰۵ ـ مثنوی رومی دفتر ۳، ص ۵

[۳] اس ضمن میں تشبیہات رومی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو: اکثر صوفیا اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص بلکہ ہر جامد شے سے بھی مخصوص قسم کی لہریں یا ارتعاشات صادر ہوتے ہیں۔ ہر شخص کے گرد ان ارتعاشات کا ایک ہالہ ہوتا ہے جو حساس نفوس کے لیے مرئی و محسوس ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ایسے لوگ جن کی حس خاص طور پر تیز نہیں ہوتی کسی اجنبی شخص کو دیکھتے ہی یا کچھ کشش محسوس کرتے ہیں یا کم و بیش منافرت۔ علم نفسیات نے بھی اس کی توجیہ کی کوشش کی ہے، مگر یہ نفسیات اہل دل کے تجربات تک نہیں پہنچتی (ص ۹۹، ۲۹۸)

درخشم و غضب کی بو تو پیاز کی طرح تیز ہوتی ہے جو صاحب کبر و حرص کی باتوں ہی سے ٹپک پڑتی ہے، ہر چند ایسا شخص اس بات کا مدعی ہو کہ وہ ہر قسم کے حرص و آز و کبر سے دور رہے:

فیل بچہ میخوری ای پاره خوار — هم برآرد خصم فیل از تو دمار
بوی رسوا کرد مکر اندیش را — پیل داند بوی خصم خویش را
آنکه یابد بوی رحمن از یمن — چون نیابد بوی باطل را ز من
مصطفی چون بوی برد از راه دور — چون نیابد از دهان ما بخور
هم بیابد لیک پوشاند ز ما — بوی نیک و بد برآید بر سما
تو همی خسپی و بوی آن حرام — میزند بر آسمان سبز فام
همره انفاس زشتت میشود — تا بوه گیران گردون می رود
بوی کبر و بوی حرص و بوی آز — در سخن گفتن بیاید چون پیاز
گر خوری سوگند "من کی خورده ام — از پیاز و سیر تقوی کرده ام"
آن دم سوگند غمازی کند — بر دماغ همنشینان بر زند[۱۲]

اس دفتر کے فوراً بعد حضرت بلال کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ محبت کی "خطا" بیگانوں کے "صواب" سے بہتر ہے۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیمبر، نبی اور رسول کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

حضرت بلال اذان دیتے وقت لفظ "حیّ" کی بجائے "ھی" پکارا کرتے تھے۔ بعض صحابہؓ نے حضور سے اس کا شکوہ کیا کہ بلال غلط لفظ ادا کرتے ہیں۔ پھر ان کی جگہ کوئی فصیح تر مؤذن مقرر کرنے کی درخواست کی۔ نبی کریمؐ کو ان صحابہؓ کی یہ بات ناگوار گذری۔ حضور نے اس سلسلے میں بعض غائبانہ عنایات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ جل شانہ کے یہاں بلالؓ کی "ھی" کو کئی "حیّ، حیّ" اور قیل و قال سے بڑھ کر شرف قبولیت حاصل ہے۔ آخر میں حضور کے ان اصحاب پر اظہار ناراضی کا ذکر کر کے مولانا نے دعاؤں میں حب و خلوص کو ضروری عنصر قرار دیا ہے:

---

[۱۲] کتاب مثنوی، ص ۲۰۶ — مثنوی رومی، ص ۱۳/ ۲

آن بلالِؓ صدق در بانگ نماز — "حی" را "ھی" خواند از روی نیاز
تا بگفتند ای پیمبرؐ نیست راست — این خطا اکنون که آغاز بناست
ای نبی و ای رسول کردگار — یک مؤذن کو بود افصح بیار
عیب باشد اوّل دین وصلاح — لحن خواندن لفظ حی علی الفلاح
خشم پیغمبرؐ بجوشید و بگفت — یک دو رمزی از عنایات نهفت
کای خسان نزد خدا ھیِ بلال — بہتر از صد حیّ حیّ و قیل و قال
وامشورانید تا من راز تان — وانگویم آخر و آغاز تان
گر نداری تو دم خوش در دعا — رو دعا می خواہ از اخوانِ صفا[۵۵]

اس دفتر میں ایک شہری اور دیہاتی کی داستان بیان ہوئی ہے۔ ایک دیہاتی کسی شہری کو بڑے الحاح کے ساتھ اپنے گاؤں آنے کی دعوت دیتا ہے لیکن جب شہری وہاں پہنچتا ہے تو دیہاتی کا رویہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ یہ کہانی جملہ ہائے معترضہ کے سبب کئی صفحات پر پھیل گئی ہے۔ اس کے دوران میں ایک جگہ اہلِ سبا کے فسق وفجور اور بعض دوسرے خرافات وصفاتِ ناستودہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے دلِ حق آگاہ کو حضرتِ یوسف سے تشبیہ دی ہے اور پھر فلسفۂ روح کے بیان میں روح کو احمدؐ قرار دیا ہے جو دستِ یہود میں درماندہ ہو۔

مولانا یہ کہہ کر کہ اہلِ سبا برادرانِ یوسف کی طرح بھائیوں کا گلا کاٹتے تھے اور جو کچھ انھیں نے کیا اس کا پورا پورا بدلہ انھیں ملا، فرماتے ہیں کہ جانتے ہو یوسف کون ہے؟ وہ تمھارا دلِ حق آگاہ (روح) ہے جسے تم نے اپنے اندر ایک قیدی کی مانند مقید کر رکھا ہے، دوسرے لفظوں میں جبرئیل کے پر و بال نوچ کر اور انھیں بری طرح زخمی کر کے ستون کے ساتھ باندھا اور پرواز سے محروم کر رکھا ہے۔ اگلے اشعار کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ انسان نے اپنی حقیقت و اصلیت بھلا کر خود کو ایک ترقی یافتہ حیوان سمجھ لیا ہے جس کی زیادہ تر توجہ صرف کھانے پینے ہی کی طرف ہے، اسی بنا پر وہ زخمی جبرئیل (روح) کو ایک پالتو جانور سمجھتے ہوئے اس کے آگے کبھی بھنا ہوا گوشت رکھتا ہے تو کبھی اسے چرانے کے لیے چراگاہ کی

---

۵۵ کتابِ مثنوی، ص ۲۰۶

طرف لے جاتا ہے، حالاں کہ اس کی خوراک دیدارِ محبوبِ ازلی ہے۔ یہ روح انسان کے ہاتھوں اس شکنجے اور آزمائش و ابتلا میں پڑنے کے خلاف خدا کے حضور داد و فریاد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ مجھے اس ظالم بھیڑیے سے نجات دلا۔ اللہ تعالیٰ اسے صبر کی تلقین فرماتا ہے۔ لیکن وہ اپنے مرکز سے دوری اور اپنے پیمانۂ صبر لبریز ہونے کا رونا روتے ہوئے کہتی ہے کہ میری کیفیت ایسے ہے جیسے حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کے نرغے میں ہوں، یا حضرت صالح ثمود کی مجلس میں پڑے ہوں۔ اس کے بعد یہ انسان کے اس ظلم کے خلاف اپنی بے تابی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہوئے، واپس بلانے کے لیے اللہ سے التجا کرتی ہے:

ہست یوسف آن دل حق جوی تو — چون اسیری بسته اندر کوی تو
جبرئیلی را بر استن بسته ای — پر و بالش را بصد جا خسته ای
پیش او گوساله بریان آوری — گه کشی او را بکهدان آوری
که بخور اینست ما را لوت پوت — نیست او را جز لقای الله قوت
زین شکنجه و امتحان آن مبتلا — میکند از تو شکایت با خدا
کای خدا افغان ازین گرگ کهن — گویدش نک وقت آمد صبر کن
داد تو واخواهم از هر بی خبر — داد که دهد جز خدای داد گر
او همی گوید که صبرم شد فنا — در فراق روی تو یا ربنا
احمدم در مانده در دست یهود — صالحم افتاده در حبس ثمود
ای سعادت بخش جان انبیا — یا بکش یا باز خوانم یا بیا
با فراقت کافران را نیست تاب — کاین فراق اندر خور اصحاب نیست[۵۷]

ان اشعار کے بعد پھر قصۂ مذکور کی طرف رجوع ہے، جس میں حضور اکرم کا ذکر سعادت اثر نبی، پیغمبر اور رسول کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اس حصے میں مولانا نے ایسے کاموں اور اشغال کو، جو انسان کو حق تعالیٰ سے دور کرنے کا سبب بنتے ہیں، حیلہ و مکر کہہ کر ان سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ ایسے اشغال سراسر حاملِ زیاں ہیں

---

۵۷ مثنوی، ص ۳/ ۱۲، ۱۳

لیکن اگر ان میں صد در صد نفع بھی ہو جب بھی اس معمولی سے زر کی خاطر گنجور سے قطع تعلق کر لینا اچھا نہیں۔

اس ضمن میں مولانا نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے صحابہ کرامؓ کو بعض مواقع پر کی گئی زجر و توبیخ کی طرف اشارہ کر کے حضور نبی اکرمؐ کے عہد کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس کی طرف قرآنِ کریم کی سورہ الجمعہ میں بھی اشارہ ہوا ہے[۵] ایک موقع پر قحط سالی کے دوران کسی تاجر نے نمازِ جمعہ کے وقت ڈھول کی آواز پر غلہ ارزاں فروخت کرنے کا اعلان کرایا۔ سرورِ کائناتؐ اس وقت خطبہ فرما رہے تھے۔ اکثر صحابہ کرامؓ خطبہ چھوڑ کر اس تاجر کی طرف لپکے تاکہ دوسرے لوگ سستا غلہ خریدنے میں ان سے سبقت نہ لے جائیں، جس کے نتیجے میں صرف چند ایک صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں رہ گئے۔ اس طرح اس تاجر نے گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ذرا سا لالچ دے کر لوگوں کو خدا سے دور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان صحابہ کو ڈانٹا گیا ہے کہ محض گندم کی خاطر تم کفر و باطل کی طرف جھک گئے اور حضور نبی اکرمؐ کو تنہا چھوڑ گئے۔ حضور کی صحبت و قربت ان باتوں، چیزوں اور مال سے کہیں افضل و اخیر ہے۔ ذرا سوچو کہ تم نے کس اعلیٰ و افضل چیز کو چھوڑ دیا۔ تم کو حرص میں آکر میرے خیر الرازقین ہونے کا بھی یقین نہ رہا۔ مولانا حریص لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ جو ذاتِ اقدس خود گندم کو روزی پہنچاتی ہے وہ تمہارے توکل کو کیوں کر نہیں پہنچائے گی۔ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ تم ایک معمولی سی شی کے لیے اس سے اپنا رابطہ توڑ لینے پر آمادہ ہو جاتے ہو، جو حقیقت میں سب کا روزی رساں ہے۔

ہر چہ از یارت جدا اندازد آن	مشنو آن را کان زیان واندہ زیان
گر بود آن سود صد در صد مگیر	بہر زر مگسل ز گنجور ای فقیر
این شنو کہ چند یزدان زجر کرد	گفت اصحابِ نبیؐ را گرم و سرد
زانکہ بر بانگِ دہل در سال تنگ	جمعہ را کردند باطل بی درنگ

---

[۵] اور (بعض لوگوں) کا یہ حال ہے کہ وہ لوگ جب کسی تجارت یا مشغول کی چیز کو دیکھتے ہیں تو وہ اس کی طرف دوڑنے کے لیے بکھر جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ جو چیز (از قسم ثواب و قرب) خدا کے پاس ہے وہ ایسے مشغلے اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے اور اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے۔ (الجمعہ: ۱۱)

تا نباید دیگران ارزان خرند — زان جلب صرفہ زما ایشان برند

ماند پیغمبر بخلوت در نہان — باد وسہ صد قریش ثابت پُرنیاز

گفت طبل لہو بازرگانئی — چون تان ببرید از ربانئی

قد فضضتم نحو فج ہائماً — ثم خلیتم نبیاً قائماً

بہر گندم تخم باطل کاشتید — وآن رسولِ حق را بگزاشتید

صحبت او خیر من لہو است و مال — بین کہ را بگزاشتی چشمی بمال

خود نشد حرص شما را این یقین — کہ منم رزاق خیر الرازقین

آنکہ گندم را ز خود روزی دہد — کی توکلہات را ضائع کند

از پی گندم جدا گشتی از آن — کہ فرستادہ است گندم ز آسمان[۹۵]

اسی شہری اور دیہاتی کی داستان میں یہ بتا کر کہ شہری اس دیہاتی کے پُر زور اصرار پر اپنے بال بچوں کو لے کر آمادہ بہ سفر ہوتا ہے، اور اس کے بچے بے پایاں مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہیں، مولانا نے خوشی اور خوش گزرانی کو بیگانہ فعل قرار دیتے ہوئے اس سے محترز رہنے اور غم کو اپنانے کی تلقین کی ہے۔ ان کے نزدیک غم[۹۶] خوشی سے بہتر اور ایک عمدہ خزانہ ہے جس سے بقا اور ارتقا میسر ہے۔ پھر مولانا گاؤں کی بجائے (جس کی تشریح وہ لعنہ میں کرتے ہیں) صحرائے دل کی طرف متوجہ ہونے کو کہتے ہیں کہ جو ہی ایمن آباد اور محکم ہے۔ اب وہ دیہاتی شہری کی طرف رجوع کرتے اور شہر کی نسبت گاؤں کو قابلِ مذمت

---

۹۵ کتاب مثنوی، ص ۲۱۲ — مثنوی، ص ۳ تا ۱۲، ۱۳

۹۶ اس کی وضاحت ڈاکٹر ہیت کے مقالہ میں تشبیہات رومی سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو: ”زندگی میں جب انسان پر رنج و غم طاری ہوتا ہے وہ ایک طرح کی پستی محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر درد و غم اور رنج و الم نہ ہوتے تو انسان اس مادی زندگی میں مست ہو کر کبھی اپنی روح کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتا، نہ اس میں دوسروں کے لیے درد دل پیدا ہوتا، نہ اسے صبر سے تکمیلِ نفس کی مشق ہوتی۔ جن لوگوں کو مادی اسبابِ حیات کی فراوانی اور دنیاوی کامیابی سے ہمیشہ مسرت ہی محسوس ہوتی ہے ان لوگوں کا شعور نہایت سطحی ہوتا ہے اور وہ اسرارِ حیات سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ محرومی اور ناکامی سے دل پر چوٹ لگتی ہے جو چشمِ بصیرت کو وا کرتی ہے۔ چوٹ کھائے ہوئے دل زیادہ بصیر و علیم ہو جاتے ہیں اور درجۂ حیات میں ان کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔“ (ص ۳۰۵، ۳۰۶)

گردانتے ہوئے اس طرف جانے سے منع کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں، گاؤں کی جانب مت جا کہ گاؤں انسان کو احمق بنا دیتا ہے ۔ اس سے عقل بے نور اور بے رونق ہو جاتی ہے ۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ روزی، رزق وغیرہ اسے گاؤں سے حاصل ہوتا ہے، حالاں کہ رزاق اور روزی رساں تو صرف ذاتِ خداوندی ہے ۔ یہاں مولانا اپنے قاری کو مخاطب کرکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قولِ مبارک نقل کرتے ہیں کہ عقل کے اندھے کا ٹھکانہ گاؤں میں ہے ۔ اس کے بعد اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایک روز گاؤں میں قیام کرلے تو ایک ماہ تک اس کی عقل ٹھکانے نہ آئے گی، اور اگر کوئی ایک دن رات وہاں ٹھہر جائے تو سمجھو ایک ماہ تک وہ عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا اور حماقت و جہالت اس کے دامن گیر ہوگئی کہ گاؤں کی حشیش کی فصل یہی کچھ ہے ۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ماہ تک گاؤں میں مقیم رہا تو جان لو کہ مدتِ مدید تک بے عقلی و بے بصیرتی اس کا مقدر بن گئی ..... گاؤں سے مولانا کی مراد اناڑی مرشد ہے جو صرف تقلید و تحبت کا دامن تھامے ہوئے ہے[۱] شہر عقل کلی کے سامنے ان حواس کی حالت بعینہٖ ان گدھوں کی سی ہے جن کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوں اور وہ چکی کے آگے جتے ہوئے بس ایک ہی ڈگر پر مسلسل چل رہے ہوں، نہ ان کی کوئی منزل ہو اور نہ نت نئے راستوں کی تلاش و جستجو سے انھیں کوئی رغبت :

شاد از غم شو کہ غم دامِ لقاست — اندرین رہ سوی پستی ارتقاست
غم یکی گنجست و رنج تو چو کان — لیک کی درگیرد این در کودکان
کودکان چون نام بازی بشنوند — جملہ با خر گور ہم تک می شوند
گام در صحرای دل باید نہاد — زآنکہ در صحرای گل نبود گشاد
این آباد است دل ای مردمان — حصن محکم، موضع امن و امان
گلشن خرم بکام دوستان — چشمہ ہا و گلستان در گلستان
دہ مرو دہ مرد را احمق کند — عقل را بے نور و بے رونق کند
خواجہ پندارد کہ روزی، دہ دہد — این نمیداند کہ روزی دہ دہد

---

۱ جیساکہ مولانا نے آگے چل کر کہا ہے، گاؤں سے ان کی مراد ایک تقلیدی و تحبتی مرشد ہے ۔ تو جو کچھ انھوں نے گاؤں کے بارے میں کہا ہے اس کا انطباق ایسے مرشد پر کرکے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے پیرو کاروں کے حق میں اس کی رہنمائی درحقیقت باعث زیاں و گمراہی ہے ۔

قولِ پیغمبرؐ شنو ای مجتبیٰ — کورِ عقل آمد وطن در روستا
ہر کہ روزی باشد اندر روستا — تا بماہی عقل او ناید بجا
تا بماہی احمقی با او بود — از حشیش دہ جزو اینہا چہ درود
آنکہ ماہی باشد اندر روستا — روزگاری باشدش جہل و عمیٰ
دِہ چہ باشد شیخِ واصل ناشدہ — دست در تقلید و در حجت زدہ
پیشِ شہرِ عقلِ کلّی این حواس — چون خران چشم بستہ در خراس[۱۱]

ایک سپیرے کی داستان میں، جو سردی سے ٹھٹھرے ہوئے ایک زندہ اژدہا کو مردہ سمجھ کر بغداد لے آتا ہے تاکہ اپنی بہادری کی ڈینگ مار سکے، مولانا نے پہلے اس عالمِ جمادات کو مذکورہ اژدہا سے تشبیہ دی اور آگے چل کر انسان کے بہانہ جو نفس کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ پہلے حصے میں بعض انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات کے ساتھ ساتھ نبی مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین معجزوں کا بھی ذکر آیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ کائنات جو تمھیں اس ٹھٹھرے ہوئے اژدہا کی مانند بظاہر مردہ نظر آتی ہے، ایک خاص زندگی کی حامل ہے۔ آفتابِ حشر طلوع ہو لینے دو پھر تم پر اس کائنات کی زندگی کے آثار و اسرار ہویدا ہوں گے۔ پھر مولانا حضرت موسیٰ کے معجزۂ عصا کا ذکر کرنے کے بعد انسان کی مثال لاتے ہیں، جس کے اجزا کا تعلق خاک سے ہوتے ہوئے بھی وہ زندگی و حرکت کا پیکر ہے۔ لہذا جب خاک، آدمی کی صورت میں مظہرِ زندگی بن سکتی ہے تو کیا یہ بات اس امر کی روشن دلیل نہیں ہے کہ اس خاک کی اپنی ایک حیات پنہاں ہے۔ خاک کی اس صورت کو پورے طور پر سمجھنا چاہیے، وہ الگ بات کہ بصیرت و دانش سے عاری انسان اس خاک و کائنات کو جمادات ہی سمجھنے پر مُصر ہے۔ مولانا ایسے انسانوں (بندہ ہائے دنیا) کو مُردہ اور برگزیدگانِ الٰہی اور حاملانِ روحانیت و مردانِ خدا کو زندہ قرار دیتے ہیں۔ اوّل الذکر جمادات کی مانند خاموش اور مؤخر الذکر جیتے جاگتے انسانوں کی طرح گویا ہیں۔ جب ذاتِ باری اپنی جانب سے کسی برگزیدہ اور زندہ و جاوید ہستی کو ہماری طرف بھیجتی ہے تو اس کے ہاتھوں عصا ایسی جامد شے بھی سراپا زندگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پہاڑ جیسی ساکت چیز بھی نغمے الاپنے لگتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں لوہا موم صفت پگھل جاتا ہے۔ ہوا اس کا

۱۱۔ کتاب مثنوی، ص ۲۱۴، ۲۱۵ — مثنوی ۱، ص ۳/ ۱۴، ۱۵

تخت اٹھائے پھرتی ہے اور سمندر اس سے محوِ تکلم ہو جاتا ہے۔ اور یہی برگزیدہ ہستی جب فخرِ موجودات احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ اقدس میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو محض اشارۂ انگشتِ مبارک پر چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ستونِ حنانہ ایسی بے جان شے بھی اس ہستیؐ سے دوری کے سبب محوِ گریہ وزاری ہو جاتی ہے، اور پتھر اس ذاتِ ارجمند و گرامی پر درود و سلام بھیجنے لگتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ اس کائنات کے پوشیدہ ذرات اپنے زندہ ہونے اور انسان کی طرح سمیع و بصیر ہونے کا ہر ہر لمحہ اعلان کرتے رہتے ہیں، لیکن انھیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے چشمِ بصیرت کی ضرورت ہے، کیوں کہ چشمِ ظاہر کے نزدیک تو وہ محض جمادات ہیں۔ مولانا کے مطابق ظاہر سے ہٹ کر باطن کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ ان جمادات کو تسبیح خوانی کی حالت میں دیکھا اور وسوسوں سے چھٹکارا پا جا سکے:

عالم افسردہ است و نام او جماد — جامد افسردہ بودہ ای اوستاد
باش تا خورشید حشر آید عیان — تا ببینی جنبش جسمِ جہان
پارۂ خاک ترا چون زندہ ساخت — خاکہا را جملگی باید شناخت
مُردہ زین سو یند و زآن سو زندہ اند — خامش اینجا و آنطرف گویندہ اند
چون از آن سوشان فرستد سوی ما — آن عصا گردد سوی ما اژدھا
کوہ ہا ہم لحن داودی شود — جوہر آہن بکف مومی بود
باد، حمّالِ سلیمانی شود — بحر با موسیٰ سخندانی شود
ماہ با احمدؐ اشارت بین شود — نار ابراہیم را نسرین شود
خاک، قارون راچو ماری درکشد — اُستنِ حنّانہ اید در رشد
سنگ، احمدؐ را سلامی میکند — کوہ، یحییٰ را پیامی میکند
جملۂ ذرّاتِ عالم در نہان — با تو میگویند روزان و شبان
ما سمیعیم و بصیریم و خوشیم — با شما نامحرمان ما خامشیم
چون شما سوی جمادی می روید — محرم جانِ جمادان کی شوید[۱۲]

---

[۱۲] کتاب مثنوی، ص ۲۲۷ — مثنوی، ص ۳/ ۲۶، ۲۷

ایک جگہ مولانا نے قرآنِ مجید کو عصائے موسیٰ سے، وصال حضور اکرمؐ کو حضرت موسیٰ کی نیند سے اور قرآنِ مجید میں ردو بدل کرنے والوں کو ان دو ساحر لڑکوں سے تشبیہ دی ہے جنھوں نے حضرت موسیٰ کو نیند میں پا کر ان کا عصا اڑانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سارا حصہ حضور نبی کریم سے خدائے بزرگ و برتر کے خطاب و وعدہ پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات کو یہ تسلی دی ہے کہ آپ کے وصال کے بعد دینِ اسلام اور قرآنِ کریم کی حفاظت میں خود کروں گا۔ مجھ سے بڑھ کر ان دونوں کا محافظ کوئی نہیں۔ میں روحانی اور مادی دونوں عالموں میں آپ کی عظمت و رونق میں روز افزوں اضافہ کروں گا۔

آغازِ اسلام کے زمانے میں مسلمانوں کے لیے کھلے بندوں اذان دینا اور نماز پڑھنا گویا اپنے اوپر کفار کے جور و ستم کو دعوت دینا تھا۔ نتیجۃً مسلمان چھپ چھپ کر نمازیں ادا کرتے اور نبی اکرمؐ کا اسمِ مبارک بھی چوری چھپے ہی لیتے، اور یوں ایک عرصہ تک دینِ متین کی تبلیغ و اشاعت کما حقہٗ آگے نہ بڑھ سکی۔ اللہ جل شانہٗ اپنے اس خطاب میں انھی حالات کا تذکرہ فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی و خوشخبری دیتا ہے کہ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب آپؐ کا نام اور دینِ اسلام چار دانگِ عالم میں پھیل جائے گا۔ سرکشوں اور نافرمانوں کو اپنے کیے کی سزا بھگتنا ہوگی۔ آپؐ کے اُمتی نہ صرف جہانِ چارسو میں پھیل جائیں گے بلکہ حکومت اور جاہ و غلبہ اُن کے پاؤں چومیں گے۔ دینِ اسلام تا قیامت دائم و قائم رہے گا، اس لیے آپؐ اس کے بارے میں قطعاً مشوّش نہ ہوں۔ آپؐ کوئی شاعر نہیں ہیں، آپؐ صادق ہیں اور حضرت موسیٰ کے ہم خرقہ۔ یہاں مولانا مذکورہ بالا تشبیہ بروئے کار لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم آپؐ کے لیے عصائے موسیٰ کی مانند ہے جو ہر قسم کے کفر کو اژدہا کی طرح نگل جائے گا۔ سو اگر آپؐ کا وصال ہو جائے تو جو کچھ آپؐ نے کہا ہے اسے عصا ہی کی مثل جانیے گا۔ ہر چند آپ زیرِ زمین محوِ خواب ہوں یہ کلامِ پاک عصا کی مانند باخبر ہوگا، اور دشمن اور سرکش اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ لہٰذا آپؐ مزے کی نیند سوئیے گا۔ آپؐ کا تنِ مبارک محوِ خواب ہوگا اور آسمان پر نورِ جاں آپؐ کی خاطر دشمنوں سے ٹکر لینے کے لیے ہمہ وقت مستعد و آمادہ رہے گا۔ اس کے بعد مولانا نے اللہ کی جانب سے فلسفیوں اور دین کے معاملے میں معذرت خواہانہ انداز رکھنے والوں کو گویا ہدفِ تنقید و سزا بنایا ہے۔

اللہ جل جلالہٗ کے اس فرمان کی صداقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ چودہ سو برس گزرنے پر بھی یہ دینِ فطرت باہمہ مشکلات و مصائب نہ صرف قائم و دائم ہے اور اس کے پیروکاروں میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے، بلکہ

آج کے اِس دورِ انتشار و افتراق میں، جبکہ اہلِ عالم مختلف اِزموں کا بھرپور تجربہ کر چکے اور اس کے نتیجے میں ذہنی سکون سے عاری ہو چکے ہیں، اس کی ضرورت کو بیش از پیش محسوس کیا جا رہا ہے، اور کوئی دن جاتا ہے جب بفضلہٖ تعالیٰ دنیا کی اکثریت اسی دینِ قیّم کی پناہ میں آ کر نہ صرف خود امن و سکون اور خوشی و خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے گی بلکہ تمام دنیا کو امن و آسائش کا گہوارہ بنا دے گی۔

آخر میں مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا نہ ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دکھایا۔ چنانچہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہر چند حضور نبی کریمؐ محوِ خوابِ ابدی ہیں، حضورؐ کا اقبال و نصیبہ بیدار اور حضور کی عظمت و سروری پہلے ہی کی طرح اپنے جھنڈے گاڑے ہوئے ہے:

مصطفیٰ را وعدہ کرد الطافِ حق	گر بمیری تو، نمیرد این سَبَق
من کتاب و معجزت را خافضم[۱۳]	بیش و کم کن را ز قرآن رافضم
من ترا اندر دو عالم رافعم	طاغیان را از حدیثت دافعم
کس نتاند بیش و کم کردن درو	تو بہ از من حافظی دیگر مجو
رونقت را روز افزون میکنم	نامِ تو بر زرّ و بر نقرہ زنم
منبر و محراب سازم بہر تو	در محبت قہرِ من شد قہر تو
نام تو از ترس پنہان می کنند	چون نماز آرند پنہان می شوند
خفیہ میگویند نامت را کنون	خفیہ ہم بانگِ نماز ای ذو فنون
از ہراس و ترس کفارِ لعین	دینت پنہان میشود زیرِ زمین
من منارہ پر کنم آفاق را	کور گردانم دو چشمِ عاق را
چاکرانت شہرہا گیرند و جاہ	دین تو گیرد زِ ماہی تا بماہ
تا قیامت باقیش داریم ما	تو مترس از نسخِ دین ای مصطفیٰ

۱۳ے مثنوی میں "خافضم" کی بجائے "حافظم" ہے اور حاشیے میں لکھا ہے کہ حافظ و رافض باہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔ تاہم بعض معتبر نسخوں میں اسی طرح آیا ہے۔ اس کے باوجود اسے کتابت ہی کی غلطی قرار دیا جا سکتا ہے نہ مولانا۔ شاید پہلا لفظ "خافض" ہو جس کے معنی نرم و ملائم کے ہیں، لیکن اس صورت میں جو معنی ہوں گے وہ کچھ دُور کی تاویل ہوں گے۔ (ص ۳ ک ۳۱)

ای رسولِ ما تو جادو نیستی — صادقی، ہم خرقۂ موسیستی
ہست قرآن مر ترا ہمچون عصا — کفرہا را درکشد چون اژدہا
تو اگر در زیرِ خاکی خفتہ ای — چون عصایش دان تو آنچہ گفتہ ای
گرچہ باشی خفتہ تو در زیرِ خاک — چون عصا آگہ بود آن گفتِ پاک
قاصدان را بر عصایت دست نی — تو بخسپ ای شہ مبارک خفتنی
تن بخفتہ، نورِ جان در آسمان — بہر پیکار تو زہ کردہ کمان
فلسفی و آنچہ پوزش می کند — قوسِ نورت تیر دوزش میکند
آنچنان کرد و ازآن افزون کہ گفت — او بخفت و بخت و اقبالش نخفت[۱۶]

اس کے بعد دو ساحر لڑکوں کا قصہ بیان ہوا ہے کہ کس طرح انھوں نے حضرت موسیٰ کو محوِ خواب پاکر ان کا عصا چرانے کی کوشش کی، لیکن چوں کہ باہمہ خواب حضرت موسیٰ کا دل بیدار تھا اس لیے لڑکے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یعنی عصا اژدہا بن کر اُن پر لپکا اور وہ بھاگ گئے لیکن بعد میں تائب ہو گئے۔ اس حصّے میں مولانا نے دلِ بیدار کا طالب بننے کی تلقین کرتے ہوئے فخرِ موجودات کا یہ قولِ مبارک دہرایا ہے کہ ہر چند بظاہر میری آنکھیں نیند میں ہوتی ہیں لیکن میرا دل بیدار ہی رہتا ہے۔ مولانا رومی صاحبِ دلِ بیدار پر اپنی جان تک فدا کرنے کو تیار ہیں۔ ان کے مطابق بیداریِ دل کے اوصاف اس قدر بے شمار اور بے حد ہیں کہ ایسی ہزاروں مثنویوں میں بھی ان کا سمانا مشکل ہے۔ بقول حکیم الامّت:

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری — مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری[۱۵]

مولانا فرماتے ہیں:

ای بسا بیدار چشم و خفتہ دل — خود چہ بیند چشمِ اہلِ آب و گل
و آنکہ دل بیدار دارد، چشم سر — گر بخسپد، برگشاید صد بصر
گر تو اہلِ نئی بیدار باش — طالبِ دل باش و در پیکار باش
ور دلت بیدار شد میخسپ خوش — نیست غایب ناظرت از ہفت و شش

---

[۱۴] کتاب مثنوی، ص ۲۳۱، ۲۳۲ — مثنوی، ص ۳/ ۲۱ [۱۵] بالِ جبریل، ص ۵۷

گفت پیغمبر کہ خسبد چشم من — لیک کی خسبد دلم اندر وَسَن
شاہ بیدار است حارس خفتہ گیر — جان فدای خفتگانِ دل بصیر
وصف بیداری دل ای معنوی — در نگنجد در ہزاران مثنوی [۱۶]

حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے موقع پر اپنے بیٹے کو کشتی میں بیٹھنے کی دعوت دی، لیکن بیٹے نے سرکشی کرتے ہوئے اس دعوت کو رد کر دیا۔ مولانا نے یہ قرآنی قصہ بیان کرنے کے بعد حضور اکرمؐ کی دو احادیث مبارکہ "الرضاء بالکفر کفرٌ" اور "مَن لم یرض بقضآئی ولم یصبر علی بلائی فلیطلب ربّاً سوائی" (جو میرے فیصلے پر راضی نہ ہوا اور جس نے میری آزمائش پر صبر اختیار نہ کیا اُسے چاہیے کہ وہ کوئی اور رب ڈھونڈ لے) میں بطریقِ تمثیل توافق پیدا کیا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ صنع اور مصنوعِ خداوندی میں معمولی سا فرق ہے جس سے صرف اہلِ روحانیت و معنویت ہی باخبر ہیں اور یہی اصحاب درحقیقت عظمت و شکوہ کے حامل اور قربِ خداوندی سے سرشار ہیں اور جو صرف مصنوع (مادیت) کے دلدادہ ہیں وہ حضورِ حق سے بہت دور یا دوسرے لفظوں میں گبر و کافر ہیں، اور یہ کہ کفر اگر از روئے قضا ہو تو وہ کفر نہیں، ورنہ حق کو کافر ٹھہراوگے اور یہ انتہائے گستاخی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے فلسفیوں، منطقیوں اور متکلمین وغیرہ کو ہدفِ تنقید و مذمت بنایا ہے جو منطقیانہ دلائل کے چکر میں پڑ کر بال کی کھال اُتارنے لگتے ہیں اور یوں کسی مسئلے کی اصل روح سے دور ہٹ جاتے ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ کل ایک ماجرا جو شخص مجھ سے کہنے لگا کہ حضورِ اکرم کی حدیثِ مبارک ہے کہ کفر کے ساتھ موافقت بھی کفر ہے، اور ظاہر ہے سید البشر کا فرمایا ہوا عین صدق ہے۔ پھر نبی کریم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمان کو ہر قضا میں راضی برضائے الٰہی ہونا چاہیے . . . تو یہ کفر و نفاق بھی تو آخر قضائے الٰہی ہی سے ہے لیکن اگر میں اس پر راضی ہوتا ہوں تو یہ بہت بڑی گمراہی ہوگی، اور اگر راضی برضا نہیں ہوتا تو یہ بھی سراسر زیان و خرابی کا سبب بنے گا۔ اس صورتِ حال میں مجھے کیا قدم اُٹھانا چاہیے۔ مولانا نے اسے بتایا کہ یہ کفر مقضی ہے قضا نہیں۔ (نتیجۂ حکم ہے خود حکم نہیں) اور سیدھے سادے لفظوں میں یہ کفر آثارِ قضا میں سے ہے، لہٰذا قضا اور مقضی میں جو فرق ہے اسے پہچانو تاکہ تمھاری یہ اُلجھن دُور ہو۔ مولانا قضا کی صورت میں کفر پر بھی راضی ہیں لیکن بصورتِ دیگر وہ اس سے بہت دُور ہیں، بقول ان کے کفر اگر قضا کی بنا پر ہو تو وہ کفر نہیں رہتا۔ اگر اس صورت میں کفر کو کفر قطعی

---

۱۶ کتاب مثنوی، ص ۲۳۴

کہا جائے گا تو ایسا کہنے والا گویا حق کو، نعوذ باللہ، کافر قرار دے گا اور یہ گستاخی کی انتہا ہوگی، جس سے حذر لازم ہے۔ یہاں مولانا کفر کو جہل اور قضائے کفر کو علم قرار دیتے ہوئے دونوں میں جو بُعد ہے، اسے حلیم (بردباری) اور غلیم (غیظ و غشم) کے الفاظ سے واضح کرتے ہیں۔ پھر نقش اور نقاش کے حوالے سے انھوں نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ نقاش ازل کا نقش زشت بھی اپنی جگہ اس کے کمال ہی کا مظہر ہے کہ وہ عمدہ نقش بھی بنا سکتا ہے تو بُرا نقش بنانے[۵۷] پر بھی قادر ہے:

دی سؤالی کرد سائل مر مرا — زآنکہ عاشق بود او بر ماجرا
گفت نکتہ "الرّضاء بالکفر کفر" — این پیمبر گفت و گفت اوست مُہر
باز فرمود اُو کہ "اندر ہر قضا — مر مسلمان را رضا باید رضا"
نی قضای حق بود کفر و نفاق ؟ — گر بدین راضی شوم باشد شقاق
وَر نیم راضی بوَد آن ہم زیان — پس چہ چارہ باشدم اندر میان ؟
گفتمش این کفر مقتضی نی قضاست — ہست آثار قضا این کفر راست
پس قضا را خواجہ از مقضی بدان — تا شکالت حل شود اندر جہان
راضیم بر کفر زآنرو کہ قضا ست — نی از آنرو کہ نزاع و کفر ماست
کفر از روی قضا خود کفر نیست — حق را کافر مخوان اینجا مایست
کفر جہل است و قضای کفر علم — ہر دو یک کی باشد آخر حلم و خلم
زشتی خط زشتی نقاش نیست — بلکہ از وی زشت را بنمودنیست
قوت نقاش باشد آنکہ او — ہم تواند زشت کردن ہم نکو
گر کشانم بحث این را من بساز — تا سؤال و تا جواب آید دراز
ذوق نکتہ عشق از من میرود — نقش خدمت نقش دیگر میشود[۵۸]

(باقی آئندہ)

---

۵۷ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں "زیادہ یقین آور یہ عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ جسے ہم زشتی کہتے ہیں وہ ہمارا ایک ذاتی اور جزوی زاویۂ نگاہ ہے۔ اگر ہستی کو بحیثیت کُل اور مشیّت ایزدی کو بحیثیت کل دیکھ سکیں تو اس تصویر کلّی میں ہر رنگ کا مقام اور ہر خط کی کشش ویسی ہی دکھائی دے گی جیسی کہ ہونی چاہیے۔ نغمے میں اتار بھی ہوتا ہے اور چڑھاؤ بھی۔ اونچے سُر بھی ہوتے ہیں اور مدھم سُر بھی، مگر بحیثیت مجموعی سب راگ دلکش ہوتا ہے۔ ہستی کے کسی ایک پہلو کو جزوی نظر سے دیکھ کر اُس کے حسن و قبح پر فتوے نہیں لگا سکتے۔" (تشبیہاتِ رومی، ص ۲۴۳)

۵۸ کتاب مثنوی، ص ۲۳۶